مکتوبات سر سیّد کی عصری معنویت

عمیر منظر ☆

Contemporary Importance of Sir Syed's Letters

Umair Manzar

Abstract:

Letters had always been an important and reliable source of history. Surprisingly, the letters written of Sir Syed Ahmad Khan were, till recently, not compiled and put together. The credit of this herculean task goes to Wahiduddin Saleem, Sir Ross Masud and Mohammad Ismail Panipati. Sir Syed was a witness of the failed mutiny of 1857 and perhaps this ignited in him the fire to attain freedom through education. The establishment of the present Aligarh Muslim University was a result of the same. Unlike Ghalib and his other contemporaries, we find the style of Sir Syed's letters to be very objective and free from unwanted adoration. The present paper tries to look at the importance of the letters of Sir Syed in the contemporary times.

Key words:

Sir syed, Letters, contemporary

کلیدی الفاظ:

سر سید، مکتوباتِ عصر، اصلاح، قوم

سر سیّد کو کچھ لوگ "حیات جاوید" کے آئینے میں دیکھتے ہیں تو کچھ انھیں شبلی کی رفاقت کے تناظر میں، حالانکہ پندرہ بیس برسوں کی قابل رشک رفاقت کے آئینے میں جان بوجھ کر بال ڈال دیا گیا ہے۔اب سر سید کو وسیع تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ معاصرین اور سوانح نگاروں کے ساتھ ساتھ خود سر سید کی تحریروں سے ان کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوتا ہے، بس ضرورت ہے ان پر غور کرنے کی؛اس تناظر میں سر سید کے خطوط کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ خطوط سر سید کے مطالعے

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی۔ لکھنؤ کیمپس، انڈیا

سے نہ صرف سر سیّد کی شخصیت کے بہت سے گوشے سامنے آئیں گے، بلکہ ان کو براہ راست سمجھنے میں مدد بھی ملے گی۔ حیرت یہ ہے کہ ایک لمبے عرصے کے بعد بھی مکاتیب سر سید کو ابھی تک باقاعدہ مرتب نہیں کیا جا سکا ہے۔ ہمیں شکر گزار ہونا چاہیے وحید الدین سلیم، سر راس مسعود، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی اور مشتاق حسین کا، جن کی کوششوں سے سر سید کے بیشتر خطوط محفوظ ہو گئے ہیں۔ سر سیّد کے خطوط سے ان کی شخصیت کے جو پہلو نمایاں ہوتے ہیں، وہ ایک اصول پسند اور غیر معمولی صبر و تحمل والے شخص کے ہیں۔ ان کی شخصیت کا یہ جوہر بطور مثال آج بھی ہندستانی معاشرے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ بڑی سے بڑی تنقید اور مخالفت کا سامنا انھوں نے کیا، مگر اصول پسندی اور تحمل کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ سر سید کو جو کچھ کہنا تھا اسے پیش کرنے میں کبھی کسی طرح کا تردد نہیں کیا۔ حالانکہ سر سیّد کے تعارف کی مختلف جہتیں ہیں۔ ایک مصلح قوم اور تعلیمی رہنما کے طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان کی یادگار ہے، جس کا ابتدائی اور مستحکم خاکہ خطبات سر سید میں دیکھا جا سکتا ہے۔ تحقیقی، تاریخی اور سیاسی شغف کا اندازہ جام جم، آثار الصنادید، سلسلۃ الملوک، تصحیح آئین اکبری، تاریخ سر کشی ضلع بجنور اور اسبابِ بغاوت ہند جیسی اہم تصنیفات سے کیا جا سکتا ہے۔ خطبات احمدیہ ابطال باطل کی نہایت عمدہ مثال ہے۔

پہلی ناکام جنگ آزادی کو سر سیّد نے بھوگا تھا اور اسی لیے اس شکست کے نتیجے میں جو ذلت اور نکبت بطور خاص مسلمانوں کے حصہ میں آئی تھی اس سے نکلنے کے لیے انھوں نے تعلیم کا راستہ تجویز کیا اور اس پر سختی کے ساتھ کاربند رہے۔ قومی اور اصلاحی جذبے کی وجہ سے سر سید کو مخالف حالات کا بھی سامنا کرنا پڑا، نیز مذہبی فکر کے معاملے میں اپنے بعض تفردات کی وجہ سے علما کا بڑا طبقہ سر سید کے خلاف ہو گیا تھا۔ اردو ادب میں سر سیّد نے جس سائنٹیفک نثر کی بنیاد ڈالی اس نے اردو ادب کو موقع فراہم کیا کہ اس میں شاعری کے علاوہ تاریخ و ثقافت، اخلاقیات، سیاسیات اور دیگر موضوعات پر اظہار خیال کیا جا سکے۔ اس انقلابی قدم نے اردو زبان و ادب کو بہت فائدہ پہنچایا۔ یہاں بھی انھوں نے ایک نئی جست لگائی اور قدیم طرز نگارش کے بجائے سادگی اور سادہ بیانی کو فروغ دیا۔

ان اصلاحی اور قومی جذبوں سے سر شار کوششوں کے اثرات بڑے ہمہ گیر ثابت ہوئے اور ان کا خاطر خواہ فائدہ ادب اور سماج دونوں کو پہنچا۔ سر سید کی علمی اور تحریکی خدمات میں ایک اہم خدمت ان کی مکتوب نگاری بھی ہے۔ سر سید کے خطوط سے ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ان کی

شخصیت اور ذاتی مزاج و میلان کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان خطوط سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مخالفتوں اور بعض ذاتی قسم کے ریمارکس میں سرسید کا موقف کیا ہوتا ہے۔ نیز ان مخالفتوں کے درمیان آخر وہ کیا چیز تھی جس سے کہ سرسید آگے بڑھتے رہے اور ان کا مشن کبھی رکا بھی نہیں۔

سرسیّد کے خطوط میں اس طرح کی ادبی چاشنی نہیں جو کہ مرزا غالب یا علامہ شبلی کے خطوط کا امتیاز ہیں۔ لیکن مافی الضمیر کی ادائیگی میں سرسید کو جو ملکہ حاصل ہے، وہ بھی کسی سے کم نہیں۔ ان خطوط کو سائنٹیفک سوسائٹی کے قیام واستحکام اور اپنے عہد سے علمی، تعلیمی اور مذہبی معاملات میں مکالمے کے لیے دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔ بعض ایسے مسائل جو کہ ہندستان کے تناظر میں بہت پیچیدہ اور مشکل بنا دیے گئے ہیں، ان پر بھی ان خطوط میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان خطوط سے مسلمانانِ ہند کی عمومی تعلیمی صورت حال، ان کا مزاج و میلان، اردو ہندی کا تنازع، کالج میں غبن، معاصرین سرسید اور بعض دیگر معاملات کو دیکھا جا سکتا ہے۔

سرسید بنیادی طور پر ایک تعلیمی تحریک کے اساس گزار تحریک کی شکل میں تعلیمی ترقی کے خواہاں تھے اور اس کے لیے بڑی بڑی صعوبتیں برداشت کیں مگر کسی مخالفت کا کبھی جواب نہیں دیا۔ پنجابی اخبار کے ایڈیٹر کو ایک خط ۱۸۸۱ میں سرسیّد نے لکھا۔ یہ خط سرسید کے مزاج، شخصی رویے اور ان کے کام کو سمجھنے میں کلیدی کردار کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔ معاصرین کے ساتھ سرسیّد کی کشادہ ظرفی بھی اس خط کے آئینے میں دیکھ سکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”میں اپنے ان نامہربان دوستوں کا جو میری ذاتی مخالفت پر سرگرم ہیں اور گو کہ وہ میری ان باتوں میں جو میری ذات سے علاقہ رکھتی ہیں کتنا ہی مبالغہ کرتے ہیں اور لوگوں کو مغالطہ دیتے ہیں اور بے سروپا اتہام کرتے ہیں، ہمیشہ ممنون رہا ہوں اور رہوں گا... میں اپنے قدیم دوست مولوی امداد العلی بہادری سی ایس آئی سے اسی خلوص سے ملتا ہوں جیسا کہ ہمیشہ ملتا تھا اور آپ کے شہر کے مشہور عالم مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب کی (جن کو دو ایک دفعہ اتفاقیہ دیکھا ہے) ایسی ہی قدر کرتا ہوں جس قدر کی وہ لائق ہیں۔ مجھ کو مطلق اس بات کا خیال نہیں ہے کہ یہ دونوں صاحب میری نسبت کیا لکھتے ہیں اور کیا کہتے ہیں۔۔۔ مدرسۃ العلوم کوئی میرا ذاتی کام نہیں ہے جہاں تک میری سمجھ ہے، میں اس کو اپنی قوم کے لیے فائدہ مند سمجھتا ہوں اور جو کچھ اس میں کوشش کی جاتی ہے وہ قومی کام ہے۔۔۔ اگر وہ مخالفت ایک رائے کے اختلاف پر مبنی ہوتی اور جو کارروائی مدرسۃ العلوم

میں ہوتی ہے اس میں نقص نکالے جاتے اور اصلاح پر رائے دی جاتی تو اس سے زیادہ خوشی کی بات نہ تھی مگر جب وہ اس میں کوئی نقص نہیں پاتے تو غلط بیانی اور بہتان بندی اور اتہام سے کام لیتے ہیں اور اس پر نہایت فخر کرتے ہیں۔۔۔ میں بھی کچھ سمجھتا ہوں اور کسی قدر قانون سے بھی واقف ہوں میں خوب جانتا ہوں کہ میں انتقام لے سکتا ہوں اور قانونی سزا دلا سکتا ہوں۔ مگر میرے لیے کیا یہ مناسب ہو گا کہ جس قوم کے ساتھ میں ہمدردی کرنا چاہتا ہوں اور جس قوم کو اپنی گود میں بٹھانا چاہتا ہوں، اس کو قانون کے حوالہ کر دوں۔"

(مکاتیب سر سیّد احمد خاں۔ حصہ اول و دوم، مرتبہ مشتاق حسین، فرنڈس بک ہاؤس، سول لائن مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ۔۱۹۶۰ء ص:۱۵۸ تا ۱۶۰)

طویل خط کے اقتباس سے سر سیّد کے عام رویے اور عمومی سوچ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس مخالفت کو بھی سمجھا جا سکتا ہے، جس کا کہ انھیں سامنا تھا۔ لیکن اس صبر اور تحمل کا جواب نہیں جس کا مظاہرہ انھوں نے کیا۔ مولوی مشتاق حسین کے نام سر سید ایک خط میں لکھتے ہیں:

"لوگ دنیا میں کسی کو چین لینے نہیں دیتے۔ پھر لوگوں کے کہنے پر خیال کرنا محض لغو ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو کام میں نے صرف خالص نیت اور صرف قومی بھلائی کے لیے کیا ہے اس کی نسبت لوگ اور بہت مقدس لوگ کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ کیسے کیسے مقدس لوگ مجھے خود غرض، بد دیانت، تعمیرات مدرسہ میں غبن اور چوری کرنے والا وغیرہ وغیرہ بیان کرتے ہیں۔ اور مقدس ہاتھوں سے جو پانچ وقت وضو سے دھوتے ہیں، ایک سلسلہ ہے آرٹکلوں، پمفلٹوں کا چھپ رہا ہے اور مشتہر ہو رہا ہے۔

پس آدمی کو اپنے خدا کے سامنے نیک نیتی سے کام کرنا چاہیے۔ لوگوں کے کہنے پر مطلق خیال کرنا غلطی ہے۔ پس اس طرح آپ کو بلحاظ اس کے کہ لوگ کیا کہیں گے، مولوی مہدی علی کے استعفی کی منظوری کے لیے کوشش کرنی چاہیے نہ کہ خلل انداز ہونا۔"

(حوالہ سابق ص:۸۷۔۸۶)

سر سیّد کے خلاف جس طرح کے حالات تھے اس خط سے بھی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولوی مہدی علی جن کا اس خط میں ذکر ہے وہ نوکری سے استعفی دے کر سر سید کے ساتھ کام کرنا چاہتے تھے جبکہ مولوی مشتاق حسین بر بنائے دوستی یہ چاہتے تھے کہ مہدی علی نوکری سے مستعفی نہ ہوں۔ اسی

لیے سر سیّد نے انھیں خط میں لکھا کہ یہ حسن سلوک نہیں بلکہ "بد سلوکی" ہے۔ اسی خط میں سر سیّد نے آگے لکھا ہے کہ وہ "بقیہ عمر میرے ساتھ علی گڑھ میں گزاریں گے۔ یا میں ان کو دفن کروں گا یا وہ مجھ کو دفن کریں گے"۔ سر سید نے قومی خدمت کے لیے کہاں کہاں سے لوگوں کو ڈھونڈ نکالا اور لوگ ملتے بھی گئے۔ غالباً یہ ان کے خلوص اور نیک نیتی کا ثمرہ تھا۔

دراصل سر سیّد کی یہ ساری کوششیں ایک وسیع تناظر کا بیانیہ ہیں۔ انھوں نے وہ حالات دیکھے تھے اور تعلیمی صورت حال پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمان تعلیم میں کس قدر پیچھے ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے کسی وجہ سے سر سیّد کی مخالفت کی ان کے سامنے یہ اعداد و شمار نہیں رہے ہوں گے سب سے بڑی بات یہ کہ وہ درد مند دل جو قومی خدمت کی راہ دکھاتا تھا، اس سے بھی محرومی رہی ہوگی۔ ۱۷ جون ۱۸۸۷ کو سر سید نے ایک خط "ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن اضلاع شمال و مغرب و اودھ، نینی تال" کے مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق لکھا۔ سر سیّد لکھتے ہیں:

> "کلکتہ یونی ورسٹی کے امتحانوں کا نتیجہ ابھی مشتہر ہو چکا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بی اے کلاس میں ۸۲۴ طالب علم پاس ہوئے ہیں مجملہ ان کے صرف ۲۲ مسلمان ہیں ایف۔ اے کے امتحان میں جو پاس ہوئے ہیں ان کی تعداد ۴۵۸ ہے جس میں صرف ۵۷ مسلمان ہیں۔ انٹرنس کے امتحان میں ۳۳۰۷ طالب علم پاس ہوئے ہیں مجملہ ان کے مسلمان صرف ۵۲۴ ہیں۔ یہ کافی ثبوت اس بات کا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم اور خصوصاً کالج کلاسوں کی تعلیم نہایت گھٹی ہوئی ہے۔ تمام برٹش انڈیا میں کوئی صوبہ ایسا نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی تعلیم اور قوموں کی تعلیم کی حالت سے خراب اور پس ماندہ نہ ہو جس کے سبب سے ان کی تمدنی حالات بھی روز افزوں زوال پذیر ہوتی جاتی ہے۔"
>
> (ایضاً ص ۴۸۱)

سر سیّد نے اس خط میں صرف ان کی تعلیمی پس ماندگی کا نقشہ ہی نہیں کھینچا ہے، بلکہ اس کے توسط سے انھوں نے حکومت کو مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی دور کرنے کے لیے اسکالرشپ کی تجویز بھی بھیجی ہے۔ اسی خط میں وہ لکھتے ہیں:

> "تیرہ برس سے میرے ہاتھ میں کالج ہے اور مجھ کو ذاتی تجربہ مسلمانوں کی حالت کا ہے۔ اس وقت تک ہمارے کالج سے علاوہ ہندوؤں کے ۹ مسلمان بی اے میں، ۵۲ ایف اے

میں پاس ہو چکے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سوائے ایک کے اگر ان کی امداد کالج کی تعلیم جاری رکھنے میں نہ کی جاتی تو ان میں سے ایک بھی وہ تعلیم حاصل نہ کر سکتا۔" (ایضاً ص:۱۸۶)

سر سیّد نے تعلیمی پس ماندگی سے مسلمانوں کو نکالنے اور اسکالر شپ کے حصول میں مسلمانوں کو بعض رعایتیں دینے کی پر زور حمایت کی۔ انھوں نے کہا کہ انٹر نس یا ایف اے میں جو فرسٹ ڈویژن پاس ہونے کے بعد ان کو جو متعینہ اسکالر شپ ملتی ہے اگر طالب علم کسی وجہ سے اپنی تعلیم کسی دوسری پریسیڈنسی کے کالج میں جاری رکھنا چاہے اور کالج کی طرف سے اس کی اخلاقی رپورٹ بہتر ہے تو اس کی اسکالر شپ اس پریسڈنسی کے کالج میں منتقل کر دی جائے۔ اس کے علاوہ ایک خاص قاعدہ صرف مسلمانوں کی تعلیمی بہتری کے لیے وضع کرنے پر زور دیا ہے۔ سر سیّد اپنے خط میں لکھتے ہیں:

"اگر آپ کے ماتحت کالجوں میں کوئی ایسا مسلمان طالب علم داخل ہو جس نے خواہ ان کالجوں سے جو آپ کے ماتحت ہیں اور خواہ کسی دوسرے پریسیڈنسی کالجوں سے انٹرنس یا ایف اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہو اور اس کو گورنمنٹ اسکالر شپ نہ ملی ہو اور وہ ایسے کالج میں داخل ہو جہاں اس کا گھر یا سکونت مستقل نہیں ہے۔ اور اس کالج کی اتھارٹی جس میں وہ داخل ہوا ہے کامل تحقیق کے بعد آپ کو طمانیت کر دے کہ اس کی حالت ایسی ہے کہ بغیر امداد کے وہ آئندہ اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتا اور وہ اتھارٹی پرائیویٹ چندہ سے اس کی امداد کرنی مناسب سمجھے تو گورنمنٹ بھی اس کی امداد میں بحصہ رسیدی شریک ہو۔ یعنی جو امداد کہ اس کو دینی تجویز ہو جس کی غایت مقدار میں آگے بیان کروں گا، اس کا نصف گورنمنٹ دے اور نصف پرائیویٹ چندہ سے دیا جائے۔

اس قاعدہ کو ان مسلمان طالب علموں کی نسبت بھی جنہوں نے انٹرنس اور ایف اے کا امتحان سکینڈ ڈویژن میں پاس کیا ہو، بہ اضافہ ایک شرط خاص کے وسعت دی جاوے۔"

(حوالہ سابق ۱۸۹۔۱۹۰)

اس خط کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ سر سیّد برطانوی ہندستان کے تعلیمی نظام میں مسلم بچوں کی بہتر کارکردگی کے لیے مستقل غور و فکر کرتے تھے اور تعلیمی ترقی کے امکانات تلاش کرتے رہتے تھے۔ اسکالر شپ کی بابت ان کی جو تحقیق ہے، اس کی بنیاد پر مسلم بچوں کے لیے حکومت کو جن

مشوروں سے آگاہ کیا ہے، اسے سر سید کے ایک انقلابی قدم سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعلی تعلیم میں مسلمان بچوں کی تعداد اس وقت بھی بہت کم تھی اور یہ صورت حال آج بھی بر قرار ہے۔ اعلی تعلیم میں آج بھی باصلاحیت اور ہونہار مسلم بچوں کے لیے اسکالر شپ بہت اہم سہارا ہے۔ آج تو اسکالر شپ کے بہت سے ادارے بھی قائم ہو گئے ہیں، جو مختلف شرائط کے ساتھ طلبہ کو اسکالر شپ دیتے ہیں۔ سر سید نے اس خط میں میرٹ کے ساتھ ساتھ معاشی پوزیشن کو بھی سامنے رکھ کر اسکالر شپ دینے کی وکالت کی ہے۔ اور بہت واضح انداز میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کی معاشی پوزیشن زیادہ خراب ہے، اس لیے وہ اسکالر شپ کے زیادہ حق دار ہیں۔ انھوں نے متوسط درجہ کے اشراف خاندانوں کا خرچ چودہ روپیہ ماہانہ کا اندازہ لگایا تھا اور اس کے بعد خط میں یہ لکھا کہ "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانوں کی مفلسی ایسے درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ وہ اس قدر خرچ کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے" ان خطوط سے تعلیم کے تئیں سر سید کی غیر معمولی کوششوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ آج مسلمانوں کے اندر جو بھی تعلیمی بیداری ہے اس میں اس پیر مرد کی انھیں کوششوں کا عمل دخل ہے۔ اس تعلیمی پس ماندگی پر ایک صدی پہلے جس نے اتنی توجہ دی اور زندگی کی بہت سی آسائشیں قربان کر دیں مگر نصب العین سے سر مو انحراف نہیں کیا۔ سر سید ڈے پر دعوتیں اڑانے والے اس خط پر غور کریں۔ خان بہادر محمد برکت علی خاں کو علی گڑھ سے ۳۱، دسمبر ۱۸۸۳ کو لکھا تھا:

> "اگر آپ پسند کریں اور اجازت دیں، یعنی کسی دوست کے پاس نہیں ٹھہرتا، ڈاک بنگلہ میں ٹھہرتا ہوں اور سب دوستوں سے کہتا ہوں کہ جو کچھ آپ میری مہمان داری یا دعوت میں خرچ کرتے ہیں وہ از راہ عنایت نقد مرحمت فرماویں۔ آپ نے سوسیٹی کے اخبار میں بہت سی ایسی رقمیں دیکھی ہوں گی بعوض دعوت، نقد روپیہ لیا گیا ہے۔"
> (حوالہ سابق ص۷۹)

مولوی حاجی علی بخش بدایوں کے رہنے والے تھے اور یہ سر سید کے شدید مخالف تھے۔ انھوں نے سر سید کے خلاف دو رسالے لکھے تھے۔ سر سیّد نے دافع البہتان نامی رسالہ انھیں کے رد میں لکھا تھا۔ شاید سر سید کا یہ رسالہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ ان کے ایک خط کے جواب میں جو کہ مدرسۃ العلوم کی دینی تعلیم سے متعلق تھا، سر سید نے لکھا کہ:

"بہر حال اب مدرسۃ العلوم میں آپ کا مددگار ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ میرے عقائد کی مداخلت کا اندیشہ جس کو آپ خلاف شرع سمجھتے ہیں، اور کمیٹی کی دست اندازی کا خوف مسائل مذہبی میں نہ رہے اور اس کے رفع ہونے کے لیے آپ یہ تجویز فرماتے ہیں کہ کمیٹی خزینۃ البضاعہ تعلیم مذہبی میں کچھ مداخلت نہ کرے اور ایک کمیٹی جس پر عام اہل اسلام کو اطمینان ہو اور متعلقہ تعلیم مذہبی کے لیے مقرر کی جاوے۔ میں نہایت دلی خوشی سے جو امر کہ آپ نے پیش فرمایا ہے اس کو بتمامہ منظور کرتا ہوں اور مجھ کو یقین کامل ہے کہ کمیٹی کے کسی ممبر کو بھی اس میں کچھ عذر نہ ہوگا۔" (ایضاً ۱۰۴۔۵۰۱)

اسی طرح تفسیر حقانی کے مفسر مولوی عبدالحق کے ایک خط کے جواب میں سرسید لکھتے ہیں۔

"آپ نے فرمایا ہے کہ مدرسۃ العلوم کی تعلیم سے ہاتھ آنا سرکاری نوکریوں کا اصلی مقصود ہے۔ اس لیے آپ فرماتے ہیں کہ سرکار میں اتنی نوکریاں کہاں ہیں جو سب مسلمانوں کو دے گی۔ جناب من آپ نے مقصود مدرسۃ العلوم پر غور نہیں فرمایا اس کا مقصد تو یہ ہے کہ مسلمان علوم وفنون میں ایسی تعلیم پاجاویں کہ بلاذریعہ نوکری خود اپنی قوت بازو سے اپنی معاش پیدا کریں۔ اور جو کہ مدارس سرکاری میں بجز نوکری پیشہ بننے کے یہ بات حاصل نہیں ہوتی اس لیے مستقل مدرسہ کے قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔" (ایضاً ۵۱۴۔۶۱۴)

یہ غلط فہمی عام طور پر پائی جاتی ہے کہ سرسیّد نے مدرسۃ العلوم اس لیے قائم کیا تھا کہ وہ انگریزوں کے لیے کلرک اور ان کی حکومت کے لیے کل پرزے پیدا کرسکیں۔ اسی خط میں سرسید نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"مروت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کی بھلائی پر کوشش کرے۔ پس آپ بھی اپنے بھائی مسلمانوں کی ترقی کے لیے کوشش کیجیے اور لوگوں سے مدرسۃ العلوم مسلمانان کے لیے للہ چندہ مانگتے پھریے اور جمع کر کر میرے پاس بھیجتے جایئے۔ حقیقت میں یہ بات ہر دم کو دم واپسیں سمجھنے پر عمل کرنے کی ہوگی کیونکہ وہ کام اپنے لیے نہ ہوگا بلکہ دوسروں کے لیے ہوگا۔" (ایضاً ۸۱۴)

واضح رہے کہ مولوی عبدالحق صاحب نے سرسید کو دنیا کی ناپائیداری کی نصیحت لکھی تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ ہر دم کو دم واپسیں جانیں۔ اس طرح کے بے شمار خطوط ہیں، جس سے سرسید کی ایک طرح

سے نئی دریافت ہو سکتی ہے۔ بالعموم سر سیّد کو قسطوں میں اور الگ الگ سمجھا جاتا ہے۔ سر سید کے ساتھ المیہ یہ بھی ہے کہ ان کی بیشتر کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ ان پر لکھنے والے یا تو ان کے پر جوش حمایتی ہیں یا وہ لوگ ہیں جنھوں نے قدیم مواد پر تکیہ کر رکھا ہے۔ سر سید کو آج بھی انگریزوں کا سخت قسم کا وفادار تصور کیا جاتا ہے اور باور کیا جاتا ہے کہ وہ انھیں کے اشاروں پر چلتے تھے۔ یہ بات بہت عام ہے، مگر اس میں پوری طرح سچائی نہیں ہے۔ ان کے دل میں احکام خدا کی محبت پوری طرح جاگزیں تھی۔ وقار الملک کا ایک انگریز آفیسر سے نماز کے معاملے میں جھگڑا ہو گیا۔ اس بات پر سر سیّد وقار الملک کو لکھتے ہیں:

> ''گو میں کسی وقت نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا۔ دو دو اکٹھی ملا کر بھی پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں لمبا سفر ہو تو مجھ سے ادا نہیں ہوتی۔ یہ سب باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے مگر تم نے اس معاملے میں جو پیش آیا نہایت لچر پنا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے خرابی سے ہو ادا کریں یا قضا کریں لیکن کوئی شخص اگر کہے کہ تم نماز نہ پڑھو، اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں... تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا کیسا ''حضور رخصت ہی دیں۔ تنخواہ کاٹ لیں'' کہنا واہیات تھا۔ تڑاق سے استعفیٰ دے دینا تھا اور صاف صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔ کیا ہوتا نوکری نہ میسر ہوتی۔ فاقے (سے) مر جاتے۔ نہایت اچھا ہوتا۔'' (مکاتیب سر سید، ص۱۸)

غالباً اسی تناظر میں علامہ اقبال نے سر سید کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

بندہ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوت فرماں روا کے سامنے بیباک ہے

سر سیّد کے ان چند مکتوبات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے عہد سے بہت آگے دیکھنے کی کوشش کی اور اس کے لیے عملی اقدام بھی کیا۔ ان خطوط کو سر سیّد کے عملی خاکوں کی ایک تصویر کے طور پر اس طرح دیکھنا ہو گا کہ یہ تصویر آج بھی روشن اور متحرک صورت میں جلوہ گر ہے اور ان کی عصری معنویت کا یہی جواز ہے۔

کتابیات

۱۔ مکاتیب سرسید احمد خاں (حصہ اول و دوم) مشتاق حسین (مرتبہ) فرنڈس بک ہاؤس سول لائن، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ۔۰۶۹۱ء

۲۔ مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقا، خواجہ احمد فاروقی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔ ۳۱۰۲

۳۔ کلیات اقبال، علامہ اقبال۔ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز۔ دہلی ۷۹۹۱